جناب سفیر اختر صاحب

وسطی ایشیا اور برصغیر پاک و ہند

تاریخی تہذیبی ثقافتی، دینی اور علمی رشتوں پر ایک نظر

(۲)

چنگیز خان اور امیر تیمور گورگان اور اُن کے قریبی اخلاف کا جو تعلق برصغیر کی سیاست سے تھا، یہ مورخین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس پر مستزاد ان دونوں "حملہ آوروں" سے مغل بادشاہت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر (م ۱۵۳۰ء) کا نسبی تعلق تھا۔ وہ باپ کی جانب سے امیر تیمور گورگان کی اولاد میں سے تھا اور ماں کی طرف سے اُس کا سلسلۂ نسب چنگیز خان سے ملتا تھا۔ بابر کے حوالے سے بھی مؤرخین نے چنگیز خان اور تیمور کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا ہے۔

چنگیز خان کے حوالے سے عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی کی تاریخ "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" معروف بہ تاریخ وصّاف کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ تاریخ ۶۹۹ھ اور ۷۱۲ھ کے درمیان لکھی گئی تھی اور نظم و نثر کے صنائع لفظی و معنوی کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ فارسی انشا پردازی کے ایک نمونے کی حیثیت سے اس کے منتخب حصے پنجاب یونیورسٹی کے نصاب "منشی فاضل" میں شامل رہے ہیں۔ اس کی جلد اوّل (تا اختتام عہد ارغون خان) شیخ محمد اقبال استاد اورینٹل کالج لاہور نے غیر ضروری عبارتوں اور اشعار حذف کرتے ہوئے مرتب کی تھی۔ نصابی کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کی شرحیں، ترجمے اور فرہنگ تیار کیے گئے ہیں جن میں سیّد اولاد حسین شاداں بلگرامی کی "فرہنگِ تاریخ وصّاف" کو طلبہ کے حلقوں میں پذیرائی حاصل رہی ہے۔

چنگیز خان پر مستقل بالذات کتابوں کے علاوہ امریکی مصنف ہیرلڈ لیم کی تالیفات "چنگیز خان" اور BARCH OF THE BARBARIANS کے تراجم کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اُردو کے بلند پایہ مترجمین نے انہیں اُردو کا جامہ بتایا ہے۔ مولوی محمد عنایت اللہ، پروفیسر عزیز احمد اور بریگیڈیر گلزار احمد نے "چنگیز خان" کے الگ الگ تراجم کیے ہیں۔

امیر تیمور گورگان کے حوالے سے سب سے پہلے "تزک تیموری" یا "ملفوظاتِ صاحبقرانی" کا ذکر آنا چاہیے جسے امیر تیمور کی خودنوشت کی حیثیت سے بعض اہلِ قلم نے بہت اہمیت دی ہے، اگرچہ امیر تیمور کی جانب اس کا انتساب مشکوک ہے۔ "ملفوظاتِ تیموری" کے اُردو میں ایک سے زیادہ ترجمے ہوئے اور لوگوں نے امیر تیمور کے بارے میں اس کتاب سے اپنی رائے قائم کی۔

امیر تیمور کی سوانح حیات اور عہد پر جو متعدد کتابیں لکھی گئی، ان میں نظام الدین شامی، شرف الدین یزدی اور عبداللہ ہاتفی کے "ظفرناموں" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نظام الدین شامی نے خود امیر تیمور کی فرمائش پر ۱۴۰۴ء اور ۱۴۰۴ء کے درمیان تیمور کے حین حیات "ظفرنامہ" مکمل کیا۔ ایک دوسرے مؤرخ حافظ ابرو نے ۱۴۲۵ء میں "ظفرنامہ شامی" کا ذیل مرتب کیا اور پھر شاہ رخ مرزا (م ۱۴۴۷ء) کے حکم سے تاج سلمانی نے "ذیل ظفرنامہ" کے نام سے شامی کی تالیف میں ۱۴۰۴ء سے ۱۴۱۰ء تک کے حالات شامل کیے۔

تیموری حکمران ابراہیم سلطان نے سرکاری کاغذات اور عینی شاہدوں کے بیانات، نیز پہلے سے لکھی گئی کتابوں کی مدد سے امیر تیمور کے حالات اور فتوحات پر تاریخ مرتب کی جسے شرف الدین علی یزدی نے اپنے خاص ادبی سلیقے سے از سر نو لکھا اور "فتح نامۂ تیموری" کا نام دیا۔ تاہم نظام الدین شامی کے "ظفرنامہ" کو اتنی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ شرف الدین یزدی کی کتاب بھی "فتح نامۂ تیموری" کے بجائے "ظفرنامہ" کے نام سے ہی مقبول ہوئی۔

ظفرنامہ تیموری (یزدی) پر انحصار کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمان جامی کے بھانجے عبداللہ ہاتفی نے (م ۱۵۲۱ء) تیمور کی فتوحات اور سیاسی کارناموں کو نظم کیا ہے جو "تیمور نامۂ ہاتفی"، یا "ظفرنامۂ ہاتفی" کے نام سے معروف ہے۔

ان "ظفرناموں" میں سب سے زیادہ مقبولیت "ظفرنامۂ یزدی" کو حاصل ہوئی ہے۔ بعد کے مؤرخین نے جن میں "روضۃ الصفا" اور "حبیب السیر" کے مصنف بالخصوص قابل ذکر ہیں، تیمور کے عہد پر لکھتے ہوئے اس پر انحصار کیا ہے بلکہ اکثر اس کی عبارتیں حذف و اختصار یا تبدیلی الفاظ کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ "ظفرنامہ" نے تاریخ نگاری کا جو نمونہ پیش کیا، بعد کے آنے والوں نے ایران اور برصغیر پاکستان و ہند میں اس کے تتبع کی کوشش کی۔

ظفرنامۂ یزدی اپنے موضوع کے لحاظ سے امیر تیمور اور اس کے جانشینوں کی تاریخ ہے مگر حقیقتاً یہ اس دور کی ایسی عمرانیاتی دائرۃ المعارف ہے کہ اس دور کے ہر طبقے کی زندگی اور معاشرت پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ ہو گئی ہے ظفرنامہ وسطی ایشیا (افغانستان، ماوراء النہر، ایران، گرجستان، ارمنستان، قفقاز) برصغیر پاکستان و ہند اور ایشیائے کوچک کی سیاسی اور حکومتی تشکیلات کے بارے میں بنیادی اور اہم اطلاعات فراہم کرتا ہے۔

برصغیر کے مغل حکمرانوں کو "ظفرنامہ" سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ بابر کے خوش طبع دوست (اور ایک روایت کے مطابق سیکرٹری) زین الدین خوافی (م ۱۵۳۴ء) نے بابر کے حملۂ ہند (۱۵۲۶ء) کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس موقع پر بابر کے سپاہیوں میں سے بعض نے "ظفرنامہ" کا مطالعہ کیا تاکہ برصغیر کے جغرافیائی حالات سے آگاہ ہوں۔ اس موقع

پرخوانی نے ظفرنامہ کے حوالے سے برصغیر کے حالات بیان کیے ہیں اور اپنے دور کے مشاہدات کے ساتھ اِن کا تقابل کیا ہے۔ جہانگیر نے عبدالستار بن قاسم لاہوری سے "ظفرنامہ" کی تلخیص تیار کرائی تھی۔ اِسی طرح شاہجہان نے بھی "ظفرنامہ" سے دلچسپی لیتے ہوئے اِس کا ایک خلاصہ مرتب کرایا۔

برطانوی دور میں "ظفرنامہ" کو مولوی الٰہ داد نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی BIBLIOTHECA INDICA سیریز کے تحت مرتب کیا جو سوسائٹی کی جانب سے دو جلدوں میں ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ "ظفرنامہ" کی اشاعت سے دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا۔ ظفرنامہ کے کلکتہ ایڈیشن میں کوئی اشاریہ شامل نہیں تھا۔ مولوی محمد شفیع (پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) نے اپنی ضرورت کے تحت اِس کی پہلی جلد میں مذکور اشخاص اور اماکن کا اشاریہ تیار کیا اور دونوں جلدوں کے مضامین کی ایک فہرست اشاریہ مرتب کی۔ وہ "ظفرنامہ" پر مزید کام کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار اُن کی یادداشتوں سے ہوتا ہے۔ اُن کی رحلت کے بعد یہ یادداشتیں پروفیسر سید وزیرالحسن عابدی نے مرتب کر دی تھیں۔

تیموری عہد کی دوسری مبسوط تاریخ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی (م ۸۸۲ھ) کی "مطلع السعدین و مجمع البحرین" ہے جو دو دفاتر (حصوں) میں منقسم ہے۔ دفتر اوّل میں "از زائش سلطان ابوسعید ایلخانی۔ تا ذکر وفات صاحبقران تیمور ہے۔ دفتر دوم "فرمانروائی شاہ رخ تا پایان فرمانروائی ابوالغازی سلطان حسین وسال ۸۷۵ھ" پر حاوی ہے۔ مولوی محمد شفیع نے "مطلع السعدین" کے دفتر دوم کا ابتدائی حصہ ۱۹۱۴ء میں اور آخری حصہ ۱۹۴۹ء میں مرتب کیا۔ (کل صفحات ۱۵۵۸) "مطلع السعدین" کے منتخب حصے منشی فاضل کے نصاب میں شامل کیے گئے اور طلبہ کی ضروریات کے لیے ان کے ترجمے اور فرہنگ مرتب ہوتے رہے۔

مولوی محمد شفیع کی "مطالعۂ تیمور" کی روایت کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے آگے بڑھایا اور تیموری سلاطین کے عہد کی فارسی شاعری پر وقیع مقالات لکھے۔

"ظفرنامۂ یزدی" کی کلکتہ، تہران اور تاشکند کی اشاعتوں کے بعد مدراس یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی و فارسی مولانا ابو ہاشم محمد یُوشع نے عبداللہ ہاتفی کا "ظفرنامہ" مرتب کیا جو یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

امیر تیمور کے حوالے سے بنیادی ماخذوں کی اشاعت کے ساتھ امیر تیمور متعدد مؤرخین کی توجہ کا مرکز رہا ہے مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی (م ۱۹۳۸ء) نے تین جلدوں میں "تاریخ اسلام" لکھی تو "وسطی ایشیا" کے حکمرانوں کے لیے کچھ صفحات مختص کیے۔ انہوں نے امیر تیمور اور سلطان بایزید یلدرم کی معرکہ آرائی پر ایک کتابچہ "جنگِ انگورہ" لکھا جو ۱۹۳۱ء میں الگ سے شائع ہوا تھا۔

ماضی قریب میں حقیقت و افسانہ کے امتزاج پر مبنی ہیرلڈ لیم کی تالیف TAMERLANE کو بہت پڑھا گیا ہے۔ اس کا اوّلین ترجمہ مولوی محمد عنائت اللہ نے ۱۹۳۰ء میں کیا تھا۔ بعد میں پروفیسر عزیز احمد نے ایک نیا ترجمہ کیا اور ۱۹۵۶ء میں بریگیڈیر گلزار احمد کے قلم سے اس کا تیسرا ترجمہ شائع ہوا۔ امیر تیمور کے حوالے سے برصغیر کے فنِ تعمیر اور مصوری پر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور اُن کے برادر عبدالرحمٰن چغتائی نے اُردو اور انگریزی میں چند مقالات لکھے ہیں۔

جسم و جان کے "فاتحین" کے حوالے سے جہاں چنگیز خان، امیر تیمور اور اِن کی اولاد مطالعہ و تحقیق کا موضوع رہی ہے، وہیں فکر و ذہن کے فاتحین میں صوفیاء و علماء اور اہلِ شعر و ادب کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ گزشتہ صفحات میں وسطی ایشیا سے آنے والے صوفیاء اور علماء کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے۔ سلسلۂ خواجگان یا سلسلۂ نقشبندیہ کی اشاعت میں خواجہ باقی باللہ نے بطور صوفی حصہ لیا مگر اُن سے پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر اس سلسلے کی تعلیمات سے اعتناء کر چکا تھا۔ بابر نے خواجہ عبیداللہ احرار کے رسالہ "والدیہ" (فارسی) کو ترکی میں نظم کیا تھا۔ خواجہ عبیداللہ احرار کی اولاد میں سے متعدد افراد برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوئے۔ اُن کے ایک پوتے خواجہ عبدالحق (بن خواجہ محمد عبداللہ) بابر کی ملازمت میں تھے۔ دونوں کے درمیان مراسلت رہتی تھی۔ مرزا کامران (فرزند بابر) خواجہ عبدالحق کا مرید تھا۔ اس خانوادے کے ایک بزرگ امیر ابوالعلاء نقشبندی (م ۱۶۵۱ء) تھے جو سلسلہ ابوالعلائیہ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ برصغیر پاکستان و ہند کے تیموری حکمرانوں میں نقشبندی سلسلے کی مقبولیت کا شاید ایک سبب یہ "تیموری" روایت بھی ہے۔

خواجہ باقی باللہ کے مرید و خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی تھے۔ اُن سے نہ صرف نقشبندی سلسلے کو برصغیر میں فروغ حاصل ہوا بلکہ مجددی بزرگوں کی مساعی سے افغانستان میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ کابل کے ملّا شور بازار خاندان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ افغانستان کے شمال مشرق کے علاقے کے نہری نظام کے بارے میں انیسویں صدی کے آغاز میں سید عزت اللہ نے "تاریخِ منازلِ بخارا" میں نقل کیا تھا کہ یہاں کی ایک نہر کا محصول آبیانہ شاہ افغانستان کی طرف سے سرہند کی خانقاہ و مزار کے لیے وقف تھا۔

نقشبندی صوفیاء — خواجہ عبدالخالق غجدوانی، خواجہ عزیزان رامیتنی، خواجہ عبیداللہ احرار، خواجہ محمد پارسا اور شیخ یعقوب چرخی وغیرہ کی تالیفات برصغیر کے ہر اچھے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ برصغیر کے نقشبندی اہلِ طریقت نے نقشبندی سلسلے کے لٹریچر کی اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ وسطی ایشیا کے نقشبندی بزرگوں کی تعلیمات عام کی گئی ہیں۔ نقشبندی متون کی ترتیب و تدوین اور ترجمہ و تلخیص کی روایت مسلسل چلی آ رہی ہے۔ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (حیدر آباد۔ سندھ) ملک محمد اقبال اور محمد نذیر رانجھا نے وسطی ایشیا کے اِن

نقشبندی بزرگوں کی کئی تالیفات جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع کی ہیں۔ سید امیر کلال (م ۱۳۷۰ء) خواجہ بہاء الدین نقشبند کے مرشد گرامی تھے۔ اُن کے احوال میں ایک رسالہ "آگاہی سید امیر کلال" کے نام سے ملتا ہے۔ پہلی بار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع ہوا۔ [کراچی، مکتبہ اعلیٰ (۱۹۶۱ء)] اسی طرح انہوں نے سات رسائل کا ایک مجموعہ "رسائل مشاہیر نقشبندیہ" [حیدرآباد (سندھ): حاجی محبوب الٰہی (۱۹۵۸ء)] مرتب کیا جس میں خواجہ عزیزان رامیتنی کا رسالہ شریفہ، خواجہ محمد پارسا کا رسالہ قدسیہ، مولانا یعقوب چرخی کا رسالہ اُنسیہ اور خواجہ عبیداللہ کا رسالہ انفاس نفیسہ شامل ہیں۔

رسالہ قدسیہ کی ایک اشاعت ملک محمد اقبال (راولپنڈی) کی کاوش سے منصۂ شہود پہ آئی۔ [راولپنڈی: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۷۵ء)] اس اشاعت کا متن محبوب المطابع۔ دہلی کی اشاعت (۱۳۰۸ھ) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی اشاعت (۱۹۵۸ء) اور چار خطی نسخوں کے تقابلی مطالعے سے متعین کیا گیا ہے۔

محمد نذیر رانجھا نے مولانا یعقوب چرخی کے رسائل۔ ابدالیہ، انسیہ، شرح اسماء الحسنیٰ اور حورائیہ [یا جمالیہ]۔ کے فارسی متن مرتب کیے ہیں اور اوّل الذکر دو رسائل کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔

فارسی متون

ابدالیہ، اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۷۸ء)

اُنسیہ، اسلام آباد، مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۳ء)

دو اثر غیر چاپی یعقوب چرخی ("شرح اسماء اللہ الحسنیٰ" اور "حورائیہ") مجلّہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۱ (۱۴۰۵ھ)، ص ۱۲-۴۷

اُردو تراجم۔

ابدالیہ، لاہور: اسلامک بک فاؤنڈیشن (۱۹۷۸ء)

اُنسیہ (مع متن)، اسلام آباد، مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۳ء)

محمد نذیر رانجھا کی تقدیم و تعلیقات کے ساتھ شیخ محمد عالم صدیقی علوی کا تذکرہ "لمحات فی نفحات القدس" [اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۶ء)] بھی شائع ہوا ہے۔ یہ تذکرہ "شرح احوال و کرامات و انتقالات و روابط بزرگانِ عارفانِ سلسلہ زکیہ جہریہ سمرقند و بخارا" سے متعلق ہے۔ مؤلف نے جس سلسلۂ تصوف کو "جہریہ" کا نام دیا ہے۔ یہ سلسلۂ خواجگان ہی کی ایک شاخ ہے جس کا نمایاں شعار ذکرِ جہر تھا اور یہ خواجہ محمد یوسف ہمدانی مرشد خواجہ احمد یسوی کی جانب منسوب ہے۔ اس کے برعکس خواجہ عبدالخالق غجدوانی ذکرِ خفی پر عامل تھے۔

وسطی ایشیا کے نقشبندی صوفیاء کے تراجم کے حوالے سے محمد نذیر رانجھا کے ساتھ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کا ذکر ضروری ہے۔ انہوں نے خواجہ محمد پارسا کے رسالہ قُدسیہ، مولانا یعقوب چرخی کے رسالہ اُنسیہ، خواجہ عزیزان رامیتنی کے رسالہ شریفہ اور خواجہ عبیداللہ احرار کے رسالہ انفاس نفیسہ کے تراجم "رسائلِ نقشبندیہ" [لاہور: مکتبہ نبویہ (س۔ن)] کے نام سے کیے ہیں۔ مولانا یعقوب چرخی کے رسالہ اُنسیہ کا ترجمہ محمد نذیر رانجھا نے بھی کیا ہے دونوں تراجم کے تقابلی مطالعے اور فارسی متن سے مطابقت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد نذیر رانجھا متن کے زیادہ قریب رہے ہیں۔

برصغیر پاکستان و ہند میں وسطی ایشیا کی سیاست سے دلچسپی کا ایک دور وہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی مستقبل کے حکمران کی حیثیت سے اس خطے کے بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی اور جب ۱۸۵۷ء کے بعد اسے شمال مغربی ہند کا اقتدار حاصل ہوگیا تو اس نے اپنے استعماری مقاصد کے تحت جو رویے اختیار کیے، اس کا جائزہ گذشتہ صفحات میں لیا جا چکا ہے۔

۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب نے جہاں دنیا بھر کے اہلِ فکر کو "اشتراکیت" کے بارے میں واضح نقطۂ نظر اختیار کرنے پر آمادہ کیا، وہیں برصغیر پاکستان و ہند کے اہل فکر نے بھی اشتراکیت کی حمایت مخالفت یا دو انتہاؤں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔

برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں نے بحیثیتِ مجموعی خدا بیزار فلسفۂ اشتراکیت کو مسترد کیا اور وسطی ایشیا پر اشتراکی تسلط کو مسلمانوں کے لیے تباہ کن قرار دیا۔ استعماری روس کے بالمقابل امام شامل جیسے اہل عزم و حوصلہ کے کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہوئے اشتراکیت کے خلاف مزاحمتی تحریک کے حق میں آواز بلند کی۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک رکن مولوی عبدالولی صدیقی نے "وقائع تسلطِ روسیا بر آسیا" (فارسی) کے نام سے ایک کتاب لکھی اور وسطی ایشیا پر روسی تسلط کو تاریخی تناظر میں دیکھا۔ یہ کتاب مؤلف نے ذاتی طور پر سلکوپہ ضلع جسور (بنگال) سے شائع کی تھی۔

علمائے کرام کا وہ گروہ جو برصغیر کی تحریک آزادی میں "انقلابی" طریقے پر یقین رکھتا تھا اور پہلی عالمی جنگ کے دوران میں اس نے جرمنی اور افغانستان کے تعاون سے آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ اشتراکی انقلاب کے بعد اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ ان علماء کے نقطۂ نظر کو تقویت اشتراکی رہنماؤں کے اس رویے سے ملی کہ انہوں نے خفیہ معاہدوں سے پردہ اٹھا دیا جو اتحادی طاقتوں نے ترکی کے مستقبل کے بارے میں باہم کر رکھے تھے۔ ان علمائے کرام اور کچھ پُرجوش نوجوانوں نے اشتراکیت کو اسلام کی معاشی تعلیمات کے قریب دیکھا اور اشتراکیت کے الحادی فلسفے کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اسلام کے مترادف قرار دیا۔ مشیر حسین قدوائی، مولانا عبیداللہ سندھی

اور مولوی برکت اللہ بھوپالی کی تحریریں اِس زاویۂ نظر کی عکاس ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور اس کی FRONT ORGANIZATIONS نے سوویت یونین کے معاشی و سیاسی نظام پر بڑی مقدار میں لٹریچر تیار کیا مگر یہ اشتراکی فلسفہ اور اشتراکی آمریت کی کامیابیوں کی مدح سرائی کے لیے وقف رہا۔ اِس میں نہ تو وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو کوئی اہمیت دی گئی اور نہ اُن کے قوم پرستانہ جذبات کی عکاسی کی گئی۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد نیم سرکاری اداروں، آزاد تنظیموں اور دینی۔ سیاسی جماعتوں نے اشتراکیت اور سرمایہ داری کے بالمقابل اسلام کے معاشی و سیاسی نظام کے خدوخال پیش کرنے شروع کیے۔ مظہرالدین صدیقی سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم اور جماعتِ اسلامی پاکستان کے قلم کاروں کی تحریریں اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ تحریکِ آزادی کے دوران میں اشتراکی ذہن رکھنے والے دانش وروں اور کمیونسٹ پارٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی کبھی حمایت نہ کی تھی البتہ انہیں انڈین نیشنل کانگرس کی "اشتراکیت" سے دلچسپی رہی، تاہم تحریکِ آزادی کے آخری مرحلے میں، جب تقسیمِ ہند نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی، اشتراکی دانش ور اداهیکاری نے برصغیر کی "مسلم قومیت" کو تسلیم کرتے ہوئے اشتراکی تومیتی فلسفے میں اسے جگہ دی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اشتراکی ذہن نے قیامِ پاکستان کی بنیاد یعنی دینی شناخت کو تسلیم نہ کیا اور وہ مزدوروں کو "سرخ سویرے" کے نام پر منظم کرنے میں کوشاں رہے۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں، کچھ پاکستان کی جانبدارانہ خارجہ پالیسی اور کچھ روس کے اپنے تعصبات کے تحت، سوویت یونین نے بین الاقوامی سطح پر آزاد ہندوستان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور یوں پاکستان میں اشتراکی تنظیموں کے لیے سرکاری یا عوامی سطح پر کوئی نرم گوشہ پیدا نہ ہو سکا۔ جن سیاسی جماعتوں نے اپنے منشوروں میں "اشتراکیت"، یا "سائنسی اشتراکیت" کو برائے وزنِ بیت شامل کیا تھا، حقیقتاً وہ بھی مارکسسٹ نہیں بلکہ سوشلسٹ ڈیموکریٹ جماعتوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کو جو کچھ بُری بھلی پذیرائی حاصل ہوئی، اس میں اشتراکی فلسفے سے زیادہ ان کے قوم پرستانہ نعروں کی کارفرمائی تھی۔

عوامی جمہوریہ چین کی آزادی اور پھر روس۔ چین کشمکش کے دور میں جب پاکستان کے تعلقات اپنے ہمسایہ ملک چین سے بہت بہتر ہو گئے اور پاکستان نے اپنے دوست کو "اقوامِ متحدہ" کی سلامتی کونسل میں لانے اور امریکہ کے ساتھ اس کے روابط استوار کرانے میں کردار ادا کیا تو پاکستان کے اشتراکیوں کو اشتراکیت کے حق میں چین۔ پاکستان دوستی کی آڑ میں پروپیگنڈے کا موقع ملا، تاہم جماعتِ اسلامی پاکستان اور بعض دوسرے اہلِ دانش نے اس صورتِ حال میں یہ بات واضح کی کہ ہمسایہ طاقت سے دوستی اپنی جگہ مگر جس طرح عوامی جمہوریہ چین اپنی آئیڈیالوجی کے خلاف کسی کو بشمول پاکستان، مخالفت کی اجازت نہیں دیتا، اِسی طرح پاکستان بھی اپنی اساس یعنی اسلام

کے بالمقابل کسی دوسری آئیڈیالوجی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی پاکستان کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" (لاہور) کے اداریہ بابت جون ۱۹۶۸ء نے عوامی سطح پر متوازن نقطۂ نظر کو عام کیا۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات گو ایک دستور ساز [اور قانون ساز] اسمبلی کے لیے تھے مگر ان انتخابات میں ملک کے معاشی مسائل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی "عوامی لیگ" نے مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے معاشی استحصال کو اپنی انتخابی مہم کا مرکزی مسئلہ بنایا، اسی طرح صدرِ پاکستان محمد ایوب خان کی پروردہ "بے لگام سرمایہ داری" کے نتیجے میں مغربی پاکستان میں جو ناہمواری پیدا ہو چکی تھی، اس نے ملک کے غریب طبقے کے لیے "اسلامی اشتراکیت" میں جاذبیت پیدا کی، گویہ جاذبیت نظریاتی سطح پر نہیں تھی بلکہ نئی سیاسی جماعت "پاکستان پیپلز پارٹی" نے اسلام کے اقتصادی نظام کو سوشلزم کے قائم مقام قرار دیا تھا۔

۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے دو برسوں میں جہاں اشتراکی فلسفۂ حیات، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں، اسلامی نظام حیات کے ساتھ اس کے تقابل پر عوامی لٹریچر وجود میں آیا، وہیں عملی سطح پر "وسطی ایشیا" کے مسلمانوں پر اشتراکیت کے جو ئے تلے جو کچھ بیت رہی تھی، اس پر بھی لکھا گیا۔ اس دور میں جن اہلِ قلم نے وسطی ایشیا کو اپنے مطالعہ کا مستقل موضوع بنایا، ان میں آباد شاہ پوری، محمد حامد اور ثروت صولت کے نام نمایاں ہیں۔ آباد شاہ پوری کی مختصر کتاب "مسلمان قومیں۔ اشتراکیت کے سائے میں" اور جامع کتاب "روس میں مسلمان قومیں" نے ایک خلا پُر کیا۔ ادارہ معارفِ اسلامی کراچی کے سیکرٹری، پروفیسر خورشید احمد نے اپنے زیرِ ادارت ماہنامہ "چراغ راہ" کا سوشلزم نمبر شائع کیا جس میں اسلام اور اشتراکیت کا دو نظاموں کی حیثیت سے تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا اور خصوصی شمارے کا ایک حصہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار کے لیے مختص تھا۔

آباد شاہ پوری اور پروفیسر خورشید احمد صاحبان کی کاوشوں کے نتیجے میں وسطی ایشیا پر تالیف و ترتیب کو ایک نئی جہت ملی اور آئندہ چند برسوں میں کچھ وقیع مقالات کے ساتھ چند کتابیں سامنے آئیں۔

وسطی ایشیا سے دلچسپی کا ایک پہلو اس خطّے کے سفرناموں کی اشاعت ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے آرمینیس ویمبری کی خود نوشت (جس کا بڑا حصہ وسطی ایشیا کی سیاحت پر مبنی ہے) کا ترجمہ "پروفیسر ویمبری کا سفرنامہ" قابلِ ذکر ہے۔ آرمینیس ویمبری جسے عثمانی خلیفہ کے دوست ہونے کا دعویٰ تھا اور ترکوں سے اس کی دلچسپی، نیز مبینہ قبولِ اسلام نے برصغیر کے مسلمان اہلِ دانش میں اس کا عمدہ IMAGE بنا دیا تھا، گو آج ہر شخص جانتا ہے کہ وہ برطانوی جاسوس کے طور پر سفر کرتا رہا تھا اور اس کا قبولِ اسلام بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک TRICK سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

آرمینیس ویمبری کے علاوہ شوکت عثمانی کا سفرنامہ "میری روس یاترا" اہم ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا سفر نامہ ہے جو سوویت یونین کی آئیڈیالوجی سے نہ صرف متفق ہے بلکہ اسے عام کرنے کے لیے والہانہ جذبہ رکھتا ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے عشرت علی صدیقی نے اپنی یادداشتیں "لینن گراڈ تا سمرقند" کے نام سے مرتب کیں مگر انہوں نے کسی نظریاتی لاگ یا لگاؤ کا کوئی ثبوت نہیں دیا بلکہ ایک آزاد خیال، غیر جانبدار سیاح کے طور پر اپنی نگاہ مناظرِ قدرت اور لوگوں کی نشست و برخاست پر رکھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بعض صحافیوں نے سوویت یونین کا دورہ کیا مگر انہیں وسطی ایشیا کی کسی ریاست میں جانے کا اتفاق نہ ہوا، ایسے سفرناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اُن سفرناموں پر ایک نظر ڈالنا مفید ہے جن میں "وسطی ایشیا" اور یہاں کی مسلم آبادی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

۱۹۵۷ء میں روسی سفارت خانے کی تگ و دو اور خواہش پر جمعیتہ علمائے پاکستان کے ایک وفد نے مولانا عبدالحامد بدایونی کی سربراہی میں سفر کیا۔ مولانا بدایونی نے سفرنامہ "تاثراتِ روس" کے نام سے مرتب کیا جو جمعیتہ علمائے پاکستان نے شائع کیا۔ وفد نے سرکاری پروگرام کے مطابق مزارات، مساجد، کتب خانے اور سرکاری مذہبی ادارے دیکھے۔ ۳۰ جون ۱۹۵۷ء کو وفد تاشقند پہنچا۔ مولانا بدایونی کے الفاظ میں۔

> حضرت مولانا قاضی ضیاء الدین صاحب ادارۂ دینیہ نے سو علماء و ائمہ مساجد کے ساتھ وفد کا استقبال فرمایا۔ تاشقند کی آبادی ایک ملین ہے۔ یہاں بیس مسجدیں ہیں جو سب کی سب آباد ہیں اور بازینت ہیں۔ (لوگ) ازبکی زبان بولتے ہیں۔ بوڑھوں میں نماز کی پابندی کا خاص طور پر شوق و جذبہ ہے، البتہ نوجوانوں میں کم ہے۔ مسلمان کافی خوشحال ہیں، راستے صاف ستھرے ہیں۔ مسلمان عورتوں میں پردہ تقریباً نہیں ہے۔
>
> ایک اور موقع پر "دینی زندگی" کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔
>
> مسجدوں کا انتظام الحمدللہ قابلِ قدر و استحسان ہے۔ ہر قاری خطبات عربی زبان ہی میں پڑھتا ہے، البتہ جمعہ کے خطبے سے قبل پاکستان و ہندوستان کی طرح ایک گھنٹہ ازبکی زبان میں مسائل و احکام بیان کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ معلومات و احکام دینی سے باخبر علماء ہیں .... مساجد میں مسلمان پوری طرح آزاد ہیں، نماز روزے کا کافی شوق موجود ہے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی کے وفد کے ایک رکن مولانا راغب احسن کو ان کے تاثرات سے چنداں اتفاق نہیں تھا۔ مولانا راغب احسن نے کوئی تفصیلی سفرنامہ تو نہ لکھا البتہ ایک تاثراتی مضمون میں واضح کیا کہ "پاکستانی علماء کے وفد کا دورہ آزاد نہیں بلکہ سرکاری نگرانی میں بالکل مقید دورہ تھا ـــــ دراصل وہ ہمیں کم چیزوں کو دکھانا اور کھیلوں، تماشوں اور ضیافتوں میں زیادہ مصروف رکھنا چاہتے تھے۔"

"تاشقند کی دینی زندگی کے بارے میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے تاثرات اوپر درج کیے جا چکے ہیں، مولانا راغب احسن نے کیا محسوس کیا؟ اُن کے الفاظ میں۔

(تاشقند) ترکی سے زیادہ روسی شہر بنا دیا گیا ہے۔ وقت کا بیشتر حصہ دس گیارہ پرانی مسجدوں اور قبرستانوں کے دکھانے میں صرف کر دیا گیا حالانکہ اِن مسجدوں میں صرف چند سفید ریش نہایت بوڑھے نمازی تھے۔ نوجوان نہ ہونے کے برابر تھے اور لڑکے تو بالکل نہ تھے۔

مولانا راغب احسن نے روسیوں کی سادگی، مہمان نوازی اور پُرجوش گرم دلی کی بے پناہ تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "روسی عوام قابلِ محبت قوم ہے۔ ان میں مغربی یورپ کی قوموں جیسا احساس برتری نہیں ہے۔ بعض حضرات کو "وسطی ایشیا" کے اکّا دکّا شہر دیکھنے کا موقع ملا مگر انہوں نے مستقل سفرنامے لکھنے کے بجائے اپنی خودنوشت تحریروں میں اپنے تاثرات شامل کیے ہیں۔ سیّد ذوالفقار علی بخاری کو "باکو" جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کے کتب خانے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ایک بات میں نے ایسی دیکھی کہ روسیوں کے جذبۂ حب الوطنی کی داد دینا پڑی۔ اس کتب خانے میں دنیا بھر کی ہر وہ کتاب موجود ہے جس میں کسی نہ کسی طرح آذربائی جان کا ذکر آیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کتاب کے مصنّف کی تصویر بھی موجود ہے۔ ایک ولولہ اٹھا کہ لاہور، پشاور، ملتان، ٹھٹھہ اور ڈھاکے کا تذکرہ دنیا بھر کی کتابوں میں موجود ہے، ہم بھی اگر وہ کتابیں اکٹھی کریں جن میں ان شہروں کا تذکرہ ہے تو شاید ہمارے نوجوانوں کو بھی اِس امر کا احساس ہو کہ ہم بھی کچھ تھے اور ہم بھی کچھ بن سکتے ہیں۔

برصغیر پاکستان و ہند سے "وسطی ایشیا" جانے والوں کے ذکر کے ساتھ وسطی ایشیا سے آنے والے سیاحوں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ اگرچہ اِن سیّاحوں کی سفری یادداشتیں یا سفرنامے اُردو میں منتقل نہیں ہوئے اور اُن کے تاثرات سے اُردو خوان طبقہ ابھی تک ناواقف ہے۔ انیسویں صدی کے سیّاحوں میں سے ایک حاجی زین العابدین مستعلی شاہ شروانی تھے۔ حاجی زین العابدین نے ترکی، ایران، عراق، مصر، اور خلیج فارس کی ریاستوں کے ساتھ برصغیر کی سیاحت کی تھی اور اپنی یادداشتیں "ریاض السیاحت" اور "بستان السیاحت" کے نام سے قلمبند کی ہیں۔ "بستان السیاحت" (تالیف ۱۲۴۷ھ/۳۲-۱۸۳۱ء) ایران سے شائع ہو چکی ہے جس میں سیّاح مؤلف نے اپنے دیکھے ہوئے شہروں کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا ہے اور اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ ڈھاکہ سے متعلق حصہ کا ترجمہ سہ ماہی بصائر (کراچی) میں شائع ہوا ہے۔